مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

اسلامی ملکوں میں نظامِ تعلیم کی اہمیت

اور وہاں کی قیادت اور فکری رجحانات میں اسکے دُور رس اثرات

یہ گرانقدر مقالہ پچھلے سال ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پچاسی سالہ جشن تعلیمی کے دوران تعلیمی مسائل پر مجلس مذاکرہ میں پیش کیا گیا۔ مولانا ندوی کا یہ مقالہ شاید اس موضوع پر بعض حیثیتوں سے حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس میں پوری صراحت، توازن اور صحیح نشاندہی اور علمی شواہد کے ساتھ ممالک اسلامیہ میں موجودہ نظامِ تعلیم کی خامیوں اور اس کے طبعی اور دور رس اثرات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ اصل مقالہ عربی میں تھا۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا کی نظر ثانی کے بعد پیش ہے۔ مقالہ ان خاص اور بیش قیمت تحریروں میں سے ہے جو روز روز مرتب نہیں کی جاسکتی ہیں۔ اعلیٰ تعلیم گاہوں، تعلیمی اور علمی مراکز کے ذمہ داروں اور ماہرینِ تعلیم سے ہماری خصوصی گذارش ہے کہ اس پر ایک نظر ضرور ڈالیں۔

—— مرتب ——

بزرگان محترم اور رفقائے کرام!

میں اس فرصت اور صحبت کو جو زمانۂ طویل کے بعد میسّر آئی ہے غنیمت سمجھتے ہوئے اور اس سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے آج ایک ایسے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں جو میرے نزدیک امت مسلمہ اور عالم اسلام کے موت وزیست اور وجود اور عدم وجود کے سوال کے مرادف ہے۔ میں پوری دیانتداری اور یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر یہ بین الاقوامی اسلامی اجتماع اس اہم اور نازک موضوع پر گہری ہمدردی اور سنجیدگی سے غور کرتا ہے، اور اس سلسلہ میں کسی نتیجہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو ہم اس کو ایک مبارک اور تاریخ ساز اجتماع کہہ سکتے ہیں۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال رہی تو وہ ملتِ اسلامی کی حیاتِ نو کا نقطۂ آغاز بن سکتا ہے۔

حضرات! آپ کی اجازت سے میں اس موضوع پر کسی قدر تفصیل اور وضاحت وصراحت کے

ساتھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں، موضوع کی نزاکت اور اہمیت اس بات کی متقاضی ہے کہ کہانی بہت دور سے شروع کی جائے۔ اس لئے کہ یہ مسئلہ آج کا یا چند مہینوں اور سالوں کا نہیں ہے۔ یہ ایک بہت قدیم مسئلہ اور پرانی مشکل ہے۔ جسکی جڑیں ملت کی زندگی اور تاریخ میں اندر تک پیوست اور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

اس مسئلہ میں پہلی نفسیاتی حقیقت جس سے صرف نظر کرنا ناممکن ہے۔ وہ اسلامی معاشرہ میں ایسے اشخاص کا وجود ہے، جن کو اس عقیدہ پر (جس پر اس معاشرہ کی اساس ہے) قلبی طور پر انشراح نہیں ہوتا اور وہ ان حقائق و مبادی اور مقاصد اور اقدار پر یقین نہیں رکھتے جن کے لئے یہ معاشرہ زندہ اور کوشاں ہے یہ دراصل ہر اس انسانی معاشرہ کا مزاج اور خاصہ ہے جو کسی مخصوص عقیدہ اور متعین حدود و قیود کا پابند ہے اور جب اس معاشرہ اور جماعت کا کوئی فرد ان حدود کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ اس کے دائرہ سے خارج یا اس کا باغی قرار دیا جاتا ہے۔ اور ان حقوق و امتیازات سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ جو اسکو اب تک حاصل تھے۔ برخلاف قومیتوں کے جن کا دروازہ ہر عقیدہ و مسلک اور ہر قسم کے صحیح اور غلط طرز زندگی اور کردار کے لئے کھلا رہتا ہے۔ اور ان کی صرف ایک شرط ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ فرد اپنی قومیت تبدیل نہ کرے۔ حکومت یا ملک کے خلاف کوئی سازش نہ کرے اور کسی قومی غداری کے جرم کا مرتکب نہ ہو۔

یہ مشکل اس وقت اور بڑھ جاتی ہے۔ اور جن لوگوں پر اس معاشرہ کے اچھے بُرے کی ذمہ داری ان کے لئے سب سے سنگین مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ عنصر (جس نے اس عقیدہ کو کبھی اخلاص کے ساتھ قبول نہیں کیا تھا یا کسی وجہ سے اس کو ہضم نہیں کر سکا تھا، یا کسی خاص سبب سے ہضم کرنے کے بعد اسے پھر خارج کر دیا تھا۔) اس مومن و مسلم معاشرہ کے دائرہ اور فریم کے اندر اس کے ایک جزء کی حیثیت سے زندہ رہنا اور پھلنا پھولنا چاہتا ہے۔ اور اپنے مستقبل کو کسی مصلحت یا مجبوری سے اس کے مستقبل کے ساتھ وابستہ کرتا ہے، لیکن بایں ہمہ اپنے کو اس کے مطابق ڈھالنا، اس کے رنگ میں رنگنا اس کو کسی حالت میں گوارہ نہیں ہوتا۔ وہ اس معاشرہ کے مسلّم و بنیادی حقائق و تصورات اور صفات و خصوصیات پر یقین نہیں رکھتا۔ اور نہ اس کے اندر اس کے لئے کوئی گرمجوشی اور اخلاص پایا جاتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ بات فتنۂ ارتداد سے زیادہ خطرناک۔ فتنہ انگیز اور دور رس ہے۔ جسکی سنگینی سے ہمارا مسلم معاشرہ واقف ہے۔

یہ مسئلہ اس وقت کچھ اور پیچیدہ بن جاتا ہے۔ جب یہ عنصر اپنی ذہانت و ہنرمندی سے عوامی اعتماد حاصل کرنے اور دوسروں پر چھا جانے کی وجہ سے زمامِ قیادت اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد پورے معاشرہ کو اس راستے پر لے جاتا ہے۔ جو اس کے نزدیک الحاد و بے دینی اور اس کے طے شدہ

اصولوں اور اخلاقی قدروں سے بغاوت کے راستے ہیں۔ بعض اوقات اس کو ان مقاصد کی طرف بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکایا جاتا ہے، جو اس کے دین وعقیدہ کے سراسر منافی یا اس کے متوازی ہوتے ہیں۔ وہ ایک ایسی عمیق نفسیاتی کشمکش سے دوچار ہوتا ہے جس سے زیادہ سخت کشمکش تاریخ انسانی تاریخ اخلاق و نفسیات اور تاریخ مذاہب میں شاید ہی کبھی پیش آئی ہو۔ وہ موت وزیست کی درمیانی اور بحرانی کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے۔ جس سے اس کو کسی وقت چھٹکارا نہیں ملتا۔

اس قیادت کے اثر سے جو اپنے معاشرہ اور قوم کے دین وعقیدہ پر ایمان نہیں رکھتی بلکہ اکثر اوقات اس سے برسرِ پیکار اور آمادۂ فساد رہتی ہے۔ فکری وذہنی ارتداد کو کھلی چھوٹ مل جاتی ہے اور ان لوگوں کی ایک بڑی تعداد جن کے پاس اخلاقی ونفسیاتی حفاظت کا کوئی سامان یا ایمانی وروحانی قوت کا کوئی ذخیرہ یا کوئی علمی وفکری حصار نہیں ہوتا۔ اس سمندر میں غرقاب ہو جاتی ہے۔ دولت کے پرستار، چڑھتے سورج کے پجاری، موقع پرست، ابن الوقت اس کا خصوصیت سے اور زیادہ آسانی سے شکار ہوتے ہیں، یا پھر دوسری شکل میں نفاق پورے معاشرہ میں عام ہو جاتا ہے، معاشرہ کی داخلی قوت ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس کا پورا ڈھانچہ اندر اندر سڑنے لگتا ہے، مکروفریب عام ہوتا ہے۔ سازشوں کی کثرت ہوتی ہے۔ غداری اور قومی خیانت کے واقعات بکثرت پیش آتے ہیں، ضمیر اور بڑی سے بڑی قابل احترام اور مقدس میراث کا سودا ارزاں اور آسان ہوتا ہے، ملک کے بڑے بڑے رقبے چند سکوں کے عوض فروخت کر دئے جاتے ہیں۔ جاسوسوں اور دشمن کے کارندوں اور ایجنٹوں کی بن آتی ہے۔ اور ان کو اس خدمت کے لئے کوئی بھی طریقہ اور حربہ استعمال کرنے سے دریغ نہیں ہوتا۔ یہ وہ صورت ہے جسکی نظیر کسی اور انسانی معاشرہ میں (جس کو یہ سخت آزمائش پیش نہیں آئی ہے یا جس کے عوام اور قیادت کے درمیان اتنی وسیع، گہری اور بنیادی ونظریاتی خلیج نہیں ہے۔) نہیں ملتی۔

اس کے نتیجہ میں یہ معاشرہ کسی بیرونی دشمن یا اندرونی خطرہ کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتا اور اس کی اصل وجہ یہی ذہنی انتشار اور نفسیاتی کشمکش، قیادت اور اس کے دئے ہوئے اعلانات اور نعروں سے عوام کی بے تعلقی اور عدم دلچسپی ہے۔ یہ سب حالات وواقعات کا منطقی نتیجہ اور نفسیات انسانی کا طبعی خاصہ ہے اور ان تمام ملکوں کی قدیم وجدید تاریخ اس پر گواہ ہے۔ جو اپنے قائدین وزعماء یا اپنے حکام وامراء کی محبت سے کبھی آشنا نہیں رہے۔ اور جہاں جمہور اور قیادت میں جذباتی ہم آہنگی اور فکری یکسانیت کبھی پیدا نہیں ہو سکی البتہ اس اسلامی سوسائٹی نے جو خود دعوت اسلامی کی اساس پر قائم تھی اور جس نے نبوت محمدیؐ کی آغوش تربیت میں پرورش پائی تھی اس طبعی اور تاریخی حقیقت اور امر واقعی کا کامیابی سے مقابلہ کیا جس کا واسطہ قدرتی

طور پر اس جماعت کو پڑتا ہے جس کی تعمیر ایمان و عقیدہ دیانت و تقویٰ اور دعوت و جہاد کی بنیادوں پر ہوئی ہو۔ نفاق کی بیماری تو صرف اس ماحول کو لگتی ہے۔ جہاں دو حریف نظریات اور مقابل قیادتیں پائی جاتی ہوں خواہ ان دونوں میں ضعف و قوت اور قلت و کثرت کے لحاظ سے کوئی تناسب نہ ہو۔ اس موقع پر وہ متردد عنصر سامنے آتا ہے۔ جو ان دونوں مخالف کیمپوں کے درمیان گھومتا رہتا ہے اور متردد رہتا ہے۔ کہ ان میں سے کس کا انتخاب کیا جائے اور کس کا دامن تھاما جائے۔ پھر کسی نہ کسی دعوت کی طرف مائل ہو کر اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ اور اس کو اپنی محبت و تعلق کا مرکز بنا لیتا ہے۔ تاہم اس کی مادی مصلحتیں اور حریف کی قوت اور عروج و اقبال اس کو اپنے موقف کے اعلان، اپنی رائے کے اظہار اور نئی دعوت کو بالکلیہ قبول کرنے سے باز رکھتا ہے اور مقابل دعوت سے اپنی رسم و راہ قطعی اور آخری طور پر ختم نہیں کرتا، قرآنِ مجید میں اسی کیفیت کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

"مذبذبین بین ذلك لا الی هؤلاء ولا الی هؤلاء (نساء : ۱۴۳)

بیچ میں پڑے لٹک رہے ہیں نہ ان کی طرف (ہوتے ہیں۔) نہ ان کی طرف۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے :

" ومنهم من یعبد الله علی حرف فان اصابه خیر اطمأن به وان اصابته فتنة انقلب علی وجهه"۔ لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کنارے پر (کھڑے ہو کر) خدا کی عبادت کرتے ہیں اگر ان کو کوئی (دنیاوی فائدہ پہنچے تو اس کے سبب مطمئن ہو جائیں اور اگر کوئی آفت پڑے تو منہ کے بل لوٹ جائیں۔ (یعنی پھر کافر ہو جائیں)

اسی لئے جیسا کہ اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ میں نفاق کا وجود نہ تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام وہاں مغلوب تھا۔ اس کے اندر نفع و نقصان پہنچانے اور تغیر و تبدل کی کوئی طاقت نہ تھی اور وہاں دو متوازی قوتیں نہ تھیں، مشرکین بڑے طاقتور اور غالب تھے مسلمان مظلوم تھے اور مغلوب تھے۔ جب اسلام مکہ سے مدینہ منتقل ہوا اور اسلامی سوسائٹی اپنے تمام لوازمات اور طبعی خاصیتوں کے ساتھ وجود میں آئی تو نفاق نے سر اٹھایا، یہ ایک ایسی قدرتی اور نفسیاتی صورتِ حال تھی جس سے کوئی مفر نہ تھا۔

لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف فرما ہونے اور سلسلۂ وحی کی وجہ سے یہ نوزائیدہ سوسائٹی ان منافقین کے ضرر سے محفوظ رہی۔ قرآنِ مجید نے متعدد جگہوں پر ان کو اچھی طرح بے نقاب کیا ہے، عام مسلمان بھی ان سے واقف اور بیزار و متنفر تھے۔ سوسائٹی نے بھی ان کو اپنے دائرہ سے خارج کر دیا تھا۔ اور ان کے لئے اس کے اندر چوری چھپے گھسنے اور خلل اندازی کرنے کا زیادہ موقع باقی نہیں رہا تھا۔ سوسائٹی

کے اعتماد کو حاصل کرنے اور منصب و اقتدار تک پہنچنے کی بات تو بہت دور کی تھی، چنانچہ یہ اولین اسلامی سوسائٹی برابر صحت مند اور ان آلائشوں سے محفوظ رہی، نفاق اس کو کمزور اور کرم خوردہ نہ بنا سکا اور منافقین کو بھی اس کو نقصان پہنچانے کا موقع نہ مل سکا۔ بلکہ ان کی کمزوری، شکست خوردگی اور بدحالی کو دیکھ کر بہت سے صحابہؓ کو جن میں بڑے جلیل القدر صحابی بھی شامل تھے۔ یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید ان کی نسل ختم ہو چکی ہے اور عہدِ نبوی کے بعد اب نفاق کا کوئی وجود نہیں رہا۔ لیکن نفاق پہلے بھی انسانی زندگی کا ایک خاصہ اور بہت سے لوگوں کی کمزوری تھا اور آج بھی ہے۔ اس نے کسی وقت قافلۂ انسانی کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔ اور ہر موقع اور گنجائش سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اور اپنی جگہ بنائی ہے۔ بہت سے اسباب و عوامل نے (جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں) اسکی ہمت افزائی کی اور اس کو تختِ سلطنت، حربی قوت اور انتظامِ حکومت کی منزل تک پہنچایا نیز علم و ادب کی محفلوں میں اس کو باریابی کا موقع دیا اور یہ سب اس عہد میں ہوا جب اسلام پیش قدمی کر رہا تھا، فاتح و با اقتدار تھا۔ اور اسلام قبول کرنے اور اسلامیت کا مظاہرہ کرنے میں بہت سے سیاسی اجتماعی اور اقتصادی فوائد بھی تھے، یہ وہ موقع تھا جب نفاق نے آگے بڑھ کر وسیع اسلامی سلطنت کے کلیدی اور اہم عہدوں پر قبضہ کر لیا اور اس میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے کسی خاص فن یا صنعت میں اپنی مہارت کی وجہ سے یا غیر معمولی ذہانت یا علمی برتری کی وجہ سے نوزائیدہ اسلامی حکومت پر پورا تسلط حاصل کر لیا اور ان میں بڑے اعلیٰ درجہ کی انتظامی صلاحیتوں کے لوگ افواج کے سپہ سالار اور ادباء و اہلِ قلم اور حکومت کے اہلِ کار پیدا ہوئے۔

ان حالات میں ایک مرتبہ سیدنا حسن بصریؒ سے نفاق اور منافقین کے موجودگی کے بارے میں سوال کیا گیا درانحالیکہ اقتدار اسلام اور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے اثبات میں اس کا جواب دیا اور صرف ان کے وجود کی تصدیق نہیں کی بلکہ اس کا اظہار کیا کہ وہ طاقت کی پوزیشن میں ہیں۔ ان سے ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت! کیا آج بھی نفاق کا کہیں وجود ہے۔؟ انہوں نے جواب دیا کہ "اگر منافقین بصرہ کی گلیوں کو چھوڑ دیں تو تم کو ویرانی کی وجہ سے وحشت ہونے لگے"۔ ایک مرتبہ فرمایا: "اگر وہ نکل جائیں تو تم اپنے دشمنوں سے عہدہ برآنہ ہو سکو" ایک موقع کہا۔ "خدا کی شان اس امت کو منافقین نے کتنا نقصان پہنچایا اور کس طرح اس پر قبضہ کر لیا[1]

اس کے بعد غیر ملکی اقتدار اور مغرب کی فکری و تہذیبی یلغار کا دور شروع ہوتا ہے۔ اور مشرق

---

[1] یہ اقتباسات محدث ابوبکر کی کتاب "صفۃ النفاق وذم المنافقین" سے ماخوذ ہیں۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۶۵

اپنے ارادہ سے یا بلاارادہ مغربی طرزِ تربیت ، نظامِ تعلیم ، دبستانِ فکر ، زندگی اور انسان کے مغربی تصور اور علوم و فنون کے مغربی زاویہ نگاہ کے سایہ میں یا زیادہ بہتر الفاظ میں اس کی گود میں اس طرح آجاتا ہے جیسے کوئی شیر خوار بچہ کسی دیرینہ سال مربی و اتالیق کی آغوش میں چلا جاتا ہے ۔ وہ اس کے پورے نظامِ تعلیم یا مختصر الفاظ میں اس کے نظریۂ تعلیم کو ساری خرابیوں اور خامیوں کے باوجود جوں کا توں قبول کر لیتا ہے ۔ جو ایک ایسی سرزمین میں پیدا ہوا اور نافذ کیا گیا جس کے عقائد ، بنیادی اصول ، اخلاقی قدریں ، اسلامی معاشرہ کی قدروں اور بنیادی و مسلمہ اصولوں سے ہر جگہ اور ہر سطح پر مختلف ہیں ، جن پر وہ پورا ایمان رکھتا ہے ۔ یا ان پر ایمان لانا ، ان کے لئے جد و جہد کرنا ان کے لئے کچھ نہ کچھ قربانی دینا اپنے لئے ضروری سمجھتا ہے ۔ بلکہ مغرب کی اخلاقی قدروں کی تردید اور ان کی بیخ کنی اور تحقیر ہی پر اس کی بنیاد ہے ۔ ایسی حالت میں اس کی مثال بعینہ اس شخص کی سی ہوتی ہے ۔ جو آبِ حیات کے شوق میں زہر کا پیالہ پینا چاہے ، یا کھاری اور نمکین پانی سے اپنی پیاس بجھانے کی کوشش کرے ۔

انہوں نے اپنے تعلیمی منصوبوں اور علمی اداروں کی تشکیل میں بیرونی ملکوں کے تعلیمی مشیروں کو پورا اختیار دے رکھا ہے ۔ اور ان ملکوں سے صرف درسی کتابیں نہیں درآمد کر رہے ہیں ۔ وہ ان ملکوں میں اپنے تعلیمی وفود بھیجتے ہیں ۔ تاکہ وہ مغربی ماہرینِ تعلیم اور اساتذہ کی تربیت میں نشو و نما حاصل کریں ، پھر ان کو ممالکِ اسلامیہ کے تعلیمی منصوبوں اور پالیسیوں کی تشکیل و تربیت کی پوری آزادی بھی دے دیتے ہیں کہ جس طرح چاہیں ان کا نقشہ بنائیں اور ان کا جو رُخ چاہیں متعین کریں ۔ اس کے نتیجہ میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو اپنے عقائد و افکار اور اپنے اخلاق و سیرت سب میں ذہنی انتشار کا شکار ہے ، فکرِ مغربی اور فکرِ اسلامی کے درمیان تذبذب کی حالت بھی لیکن غنیمت تھی لیکن اس نے اکثر اوقات اپنے ملک و ملت اور اپنے معاشرہ کے سارے معتقدات و مسلمات اور اصول و اقدار سے کنارہ کشی اختیار کر لی ۔

یہ ایک بالکل قدرتی بات تھی جس پر کوئی تعجب نہ کرنا چاہیئے ۔ بلکہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو مقامِ تعجب تھا ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ماہرین اور مشیرانِ تعلیم اور ان کے شاگرد اپنے کام میں مخلص ہوں اور اس تعلیمی پالیسی اور منصوبہ بندی میں ان کے پیشِ نظر اسلامی ملکوں اور نئی نسلوں کی فلاح و ترقی ہو ، لیکن یہ فرض کر لینے سے بھی ان ملکوں میں پیدا ہونے والے فکری اضطراب اور بنیادی تضاد اور ناہمواری میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اور تصویر اسی طرح تاریک رہتی ہے ۔ ان میں سے اکثر لوگوں کی اس خامی کو اس پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے ۔ کہ وہ دین سے اور اس کی بنیادوں اور اصولوں سے مسلم اقوام کے

مزاج و کردار اور ان کی شخصیت و دعوت کے مطابق اور منافی دونوں چیزوں سے واقف نہیں ہوتے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ ان ملکوں اور قوموں کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہوں لیکن ان کو بچانے کی یہی کوشش ان کی ہلاکت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ ان غیر ملکی تعلیمی مشیروں کے سلسلہ میں مجھے DAN ADAMS کا یہ تبصرہ بہت پسند آیا جو اس نے اپنی کتاب EDUCATIONAL PATTERNS IN CONTEMPORARY SOCIETIES میں کیا ہے۔

ایک مشرقی حکایت غیر محتاط غیر ملکی تعلیمی مشیروں سے سرزد ہونے والی غلطیوں کی پوری تصویر کشی کرتی ہے۔ کسی زمانہ میں ایک بہت بڑا سیلاب آیا جس میں ایک بندر اور ایک مچھلی پھنس گئے، بندر تیز و طرار اور تجربہ کار تھا۔ لہٰذا ایک درخت پر چڑھ کر وہ سیلاب کی طوفانی موجوں سے محفوظ مقام پر جا بیٹھا، اب اس نے نیچے نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہے کہ غریب مچھلی امنڈتی ہوئی لہروں کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہے پوری ہمدردی اور نیک نیتی کے جذبہ کے ساتھ وہ نیچے آیا اور اس نے مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا پھر جو نتیجہ نکلا وہ ظاہر ہے [1]

عہدِ حاضر کے ماہرین تعلیم نے بالاتفاق اس کا اظہار کیا ہے کہ:

"تعلیم کوئی ایسا تجارتی سامان نہیں ہے جو درآمد یا برآمد کیا جا سکے مثلاً مصنوعات، کچا مال یا وہ ایجادات و ضروریات جو کسی ملک اور علاقہ کے ساتھ مخصوص نہیں، وہ ایسا لباس ہے جو ان اقوام کے قدوقامت و جسامت کی ٹھیک ناپ کے مطابق تراشا اور سیا جاتا ہے۔ اور پسندیدہ و محبوب علم و فن اور ان مقاصد کو سامنے رکھ کر تیار کیا جاتا ہے۔ جن کے لئے وہ ہر طرح کی قربانی دے سکتی ہیں [2]"

اور یہ کہ:

"تعلیم صرف اس عقیدہ کو مضبوط کرنے کا ایک مہذب اور شائستہ طریقہ ہے۔ جس کا حامل یہ ملک یا قوم ہے۔ اس کا مقصد فکری طور پر اس کو غذا دینا اس پر اعتماد پیدا کرنا اور اگر ضرورت ہو تو علمی دلائل سے اس کو مسلح کرنا ہے، وہ اس عقیدہ کے دوام و بقا کا وسیلہ اور بے کم و کاست آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے کا ایک طریقہ ہے، نظامِ تعلیم کی بہترین تعریف یہ ہے کہ وہ والدین اور

---

[1] I.N. THUT AND DON ADAMS: EDUCATION PATTERNS IN CONTEMPORARY SOCIETIES" MCGRAW HILL BOOK CO. NEW YORK. PAGE. 63

[2] "نحو التربیۃ الاسلامیۃ الحرۃ۔"

مربیوں اور نگرانوں کی اس سعی پیہم کا نام ہے جو وہ اپنی اولاد کو اپنے دین و مسلک پر قائم رکھنے کے لئے کرتے رہتے ہیں اور ان کی اس طرح تربیت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ان کے ورثہ کے (جو انہوں نے اپنے آباؤ اجداد سے حاصل کیا تھا) صالح و اہل وارث اور امین ثابت ہوں، اور ان کے اندر اس ثروت میں اضافہ اور توسیع اور اس کو ترقی دینے کی پوری صلاحیت ہو۔ [۱]

برطانیہ کے ماہرین تعلیم کی ایک رپورٹ میں یہی بات کہی گئی ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

"ریاست کا مفاد اس میں ہے کہ وہ دیکھے کہ اسکولوں کے ذریعہ قومی زندگی کے مکمل اجزاء نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے ہیں۔ اس کا کام ہے کہ یہ دیکھے کہ طلبہ قومی مفاد کے مقررہ معیار کی کارکردگی کو قائم رکھتے ہیں اور اسے ترقی دیتے ہیں۔ ریاست کی ظاہری تعلیمی سرگرمی کے پس پشت غیر مرتب لیکن معاشرہ کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے۔ کہ بچے قومی خصوصیات کے جانشین بنتے ہیں۔"

گارفورڈ (GAR FORD) نے اپنی کتاب "EDUCATION AND SOCIAL PURPOSE" میں اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

اوّلین طور پر تعلیم کے مقصد کو سماج کی روایات اور اس کے موجودہ اقدار پر پرکھنا چاہیئے، کیونکہ یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر اس کی خصوصیات اور بقا منحصر ہے۔ اور یہ بے حد ضروری ہے۔ کہ ان دونوں کے درمیان دفعتاً کوئی بے ربطی نہ پیدا ہو۔ اس کی بجائے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ ترقی کی ہر کوشش سماج کے مسلّم اقدار کی بنیاد پر ہو۔ [۲]

ایک اور ماہر تعلیم VERNON MALLINSON کی شہادت میں اس سے زیادہ یقین اور صراحت سے کام لیا گیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

ایک قسم کا ذہنی منشور جو پورے معاشرہ کے مشترکہ مقصد اور مشترکہ کوششوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ایک طرح پر بڑے پیمانہ پر قومی جذبہ کی عکاسی کرتا ہے۔ اور ان خصوصیات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جو معاشرہ کے نصب العین کی خوبی کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ [۳]

---

[۱] اس کی تائید میں ملاحظہ ہو مشہور ماہر تعلیم جان ڈیوی کی فنِ تعلیم پر تصنیفات اور تحریریں نیز مقالہ (ADUCATION) مندرجہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکہ۔

[۲] F.W. GAR FORD. "EDUCATION AND SOCIAL PURPOSE" London (1962) P- 146/47

[۳] AN INTRODUCTION TO THE STUDY OF COMPARTIVE EDUCATION London. 1957 (Page -4)

مغرب اپنے سیاسی نظاموں اور مکاتب خیال کے اختلاف، نیز اپنے مشرقی و مغربی کیمپوں اور اپنی ساری قومی بیماریوں اور نقائص اور خامیوں کے باوجود اس تعلیمی پالیسی پہ پوری طرح کاربند ہے۔ اور تعلیم و تربیت کے تمام شعبوں میں اس نے اس کو تمام و کمال نافذ کر رکھا ہے۔ اور اس کے تمام تعلیمی پروگرام اور تعلیمی پالیسیاں اسی مقرر کردہ اصول کی تابع ہیں۔

سوویت یونین بھی جو انقلابی ذہن اور اپنی انتہا پسندی میں مشہور ہے، اس اصول کو نافذ اور جاری کرنے میں سرمایہ دارانہ جمہوری حکومتوں سے پیچھے نہیں رہا، بلکہ شاید اپنے اشتراکی نظریہ کی حفاظت اور انقلابی روح کی بنا پر اس اصول کو عملی جامہ پہنانے میں وہ ان ممالک سے بھی آگے ہے۔

ایک سرکاری حکم نامہ محررہ ۱۲ر نومبر ۱۹۵۸ء میں یہ کہا گیا ہے کہ۔

" ان خصوصیات کے حصول میں سماجی علوم (SOCIAL SCIENCES) کی تعلیم ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ مارکسزم، لینن ازم کے مبادیات کا علم ہر فن کے ماہرین کے لئے اشد ضروری ہے۔ ہمارے نوجوانوں کی تربیت اس طرح ہونی چاہئے کہ ان میں بورژوا نصب العین اور احیاء پرستی کے خلاف تعصب کی روح سرایت کر جائے "[1]

یہی وہ چیز ہے کہ جس کی وجہ سے مغرب اس نقصان سے محفوظ رہا جس کا شکار مشرق کے اسلامی و غیر اسلامی ممالک سب ہیں۔ چنانچہ آج مغرب میں عوام اور قیادت یا جمہور اور حکومت میں کسی گہری اور وسیع نظریاتی، ذہنی و فکری خلیج کا سراغ نہیں ملتا، وہاں صرف ایک طرز اور ایک آئیڈیل اور ایک قسم کے اصول و نظریات اور مقاصد و نصب العین پائے جاتے ہیں، وہاں مختلف طبقات اور سوسائٹی کے افراد کے درمیان کسی قسم کی ذہنی اور نفسیاتی رسہ کشی نہیں اور اسی وجہ سے یہ ممالک اندرونی سازشوں اور بغاوتوں سے محفوظ ہیں۔

مغرب کے بعد ان مشرقی ممالک کا نمبر آتا ہے۔ جو مدت دراز سے اپنا کوئی عقیدہ نہیں رکھتے اور ان کو ان حقائق پر یقین نہیں جن کی ایمان بالغیب اور انبیاء کی تعلیمات و ہدایات پر بنیاد ہے۔ ان کے پاس متعین آسمانی تعلیمات یا محفوظ آسمانی صحیفے بھی نہیں ہیں۔ وہ صرف ان قومی روایات اور جماعتی و شخصی مفادات کی حامل ہیں جن کو یہ تعلیمی نظام اور پروگرام چیلنج نہیں کرتے اور کسی جگہ ان دونوں کا کراس نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ ممالک بھی اسی طرح اس تضاد سے محفوظ ہیں جو مغربی نظام تعلیم پیدا کرتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ انہوں نے اس نظام تعلیم سے صلح و صفائی کر لی ہے۔ اور دونوں میں پوری مفاہمت پائی جاتی ہے، یا انہوں نے اپنے آپ کو ان تعلیمی و تربیتی نظریات کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ اور اسی لئے انقلابات

اور سازشوں کا تناسب یہاں بہت کم اور تضاد بھی بہت کم یا اتنا کمزور ہے کہ قومی زندگی پر اس کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا، ملک سے غداری اور قومی خیانت کے واقعات شاذ و نادر ہوتے ہیں، اور یہاں بھی عوام اور رہنما طبقہ میں وہ وسیع خلیج حائل نہیں ہے جو ہمیں اسلامی ملکوں میں نظر آتی ہے۔ ان ممالک کے امراض اور ان کے عیوب دوسری نوع کے ہیں۔ اور اس کے اسباب و عوامل بھی بالکل دوسرے ہیں جن کا تعلق ان کی تاریخ، ان کے قومی مزاج مخصوص عقائد دینی حاسہ کی کمزوری، شعور کی کمی اور نظامِ تعلیم و تربیت کے فساد سے ہے۔

جہاں تک اسلامی ممالک کا تعلق ہے وہاں یہ کشمکش اور عجیب تضاد بڑے وسیع پیمانہ اور مختلف سطح پر پایا جاتا ہے۔ وہاں ایک طرف حکومت اور جمہور میں کشمکش ہے۔ دوسری طرف اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کم پڑھے لکھے یا ناخواندہ لوگوں میں رسہ کشی ہے۔ تیسری طرف دیندار اور آزاد خیال اور ترقی پسند افراد دست و گریباں ہیں اور یہ سب نتیجہ ہے اس نظامِ تعلیم کا جو مغربی ملکوں سے درآمد کیا جا رہا ہے۔ یا مغربی ذہن اور نظامِ تعلیم کے خطوط پر خود ان ملکوں میں تیار کیا جا رہا ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں ایک ایسی نسل پیدا ہو رہی ہے جو ان عقائد اور حقائق کو پوری طرح ہضم اور قبول نہیں کر پاتی، جن پر اس کے معاشرہ اور اس امت کی بنیاد ہے۔ اس لئے کہ یہ نظامِ تعلیم جس طرح کے خیالات کی آبیاری اس کے دل و دماغ میں کرتا ہے وہ ان حقائق اور عقائد سے کھلے طور پر متصادم ہیں جو اس معاشرہ کے لئے ناگزیر ہیں، کبھی خارق عادت طریقہ پر یا کسی بیرونی اثر سے وہ اس کو قبول کرتی ہے، تو لازماً اس کے نتیجہ میں یہ نظامِ تعلیم ضرور کمزور پڑتا اور دیتا ہے۔ لیکن ایسا بہت شاذ و نادر ہوتا ہے۔

جب یہ طبقہ اس نظام کی آغوش میں تربیت پا کر نکلتا ہے۔ تو قوم کے عقیدہ، خیالات اور جذبات سے اس کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے، اگر وہ قوی الارادہ ہوتا ہے تو وہ رجعت پسندی کے ملبہ کو (جیسا کہ اس طبقہ کے معین افراد یہ اصطلاح استعمال کرتے ہیں) راستہ سے ہٹا کر اپنی قوم و ملک کو ماضی کے بارِ گراں سے رہائی بخشنا چاہتا ہے۔ اس موقع پر ایک ایسی طویل کشمکش برپا ہوتی ہے جس پر ملت کی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں بے دریغ خرچ ہوتی ہیں۔ اور اندرونی خانہ جنگیوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جو بیرونی جنگوں سے بڑھ جاتا ہے۔ یہ ان ممالک کا قصہ ہے۔ جہاں ایسی قیادتیں برسرِ اقتدار تھیں جو انقلابی، قوم پرستانہ اور لادینی فلسفوں اور دعوتوں پر یقین رکھتی تھیں۔

اگر اس طبقہ کی قوتِ ارادی کمزور ہوتی ہے۔ اور وہ طاقت و شخصیت سے محروم ہوتا ہے۔ تو وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور اس کے اندر ان عقائد اور مقاصد کی طرف سے دلی نفرت پیدا ہو جاتی

ہے۔ وہ آئے دن اس کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتا ہے۔ غیر ملکوں اور بیرونی طاقتوں سے سازباز کر لیتا ہے۔ اور عوام کے قومی جذبہ اور دباؤ اور علماء و دعوتِ دین کے علمبرداروں کے اثر و رسوخ سے پہلی فرصت میں چھٹکارا حاصل کر لینا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس کے نتیجہ میں غداری کے واقعات بار بار پیش آتے ہیں اور یہ ممالک مستقل طور پر بے یقینی، خوف و دہشت، ذہنی انتشار اور شبہ و بے اعتمادی کی فضا میں رہتے ہیں۔

اس غیر فطری اور غیر ضروری صورتحال سے چھٹکارا پانے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے۔ کہ اس پورے تعلیمی نظام کو یکسر تبدیل کر دیا جائے اور اس کو ختم کر کے نئے سرے سے ایک نیا نظامِ تعلیم تیار کیا جائے جو اس ملت اور امت کے قد و قامت پر راست آتا ہو اور اسکی دینی و دنیاوی ضروریات پوری کر سکتا ہو۔

یہ عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ اسکی سب سے اہم اور ناگزیر ضرورت، وقت کی آواز اور اسلامیان عالم کا سب سے بڑا فرض ہے۔

اس مسئلہ کا حل خواہ وہ کتنا ہی دشوار نظر آ رہا ہو اور صبر آزما اور وقت طلب ہو، اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظامِ تعلیم کو از سرِ نو ڈھالا جائے اور اسکو امتِ مسلمہ کے عقائد، زندگی کے نصب العین، مقاصد اور ضروریات کے مطابق بنایا جائے اور اس کے تمام اجزاء سے مادیت، خدا سے سرکشی، اخلاقی و روحانی قدروں سے بغاوت اور جسم و خواہشات کی پرستش کی روح اور اسپرٹ کو ختم کیا جائے اور اس کے بجائے تقویٰ، انابت الی اللہ، آخرت کی اہمیت اور فکر اور پوری انسانیت پر شفقت کی روح اس میں جاری و ساری کر دی جائے۔ اس مقصد کیلئے زبان و ادب سے لے کر فلسفہ اور علم النفس تک اور علوم عمرانیہ سے لے کر اقتصادیات و معاشیات تک صرف ایک روح پیدا کرنا ہو گی، مغرب کے ذہنی غلبہ اور تسلط کا خاتمہ کرنا ہو گا اس کی قیادت و امامت کا انکار کرنا پڑے گا۔ اس کے علوم و نظریات پر علمی تحلیل و تجزیہ اور بے لاگ تنقید کا مسلسل اور جرأت مندانہ عمل کرنا ہو گا۔ اور یہ ثابت کرنا ہو گا کہ مغرب کی کامیابیوں اور پیش قدمیوں نے انسانیت اور تہذیب کو کتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے۔

اس کے علوم کے ساتھ مواد خام (RAW MATERIAL) کا سا معاملہ کرنا ہو گا۔ اور اس سے وہ چیزیں تیار کرنا ہوں گی جو ان قوموں اور ملکوں کی اپنی ضروریات رجحانات اور ان کے عقیدہ و تہذیب سے ہم آہنگ ہوں۔

"اس راہ میں اگرچہ بہت سے سنگِ گراں ہیں اور نتائج بھی بہت تاخیر سے ظاہر ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ تجدد پسندی، آزاد خیالی، اور مغرب کی ذہنی غلامی کی اس طوفانی موج کو روکنے کا واحد طریقہ ہے۔ جس نے

عالمِ اسلام کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اور اسلام کے فکری و اجتماعی ڈھانچہ اور ملتِ ابراہیمی کے شیرازہ کے لئے ایک چیلنج بن گئی ہے۔ اور جس کے نتیجہ میں مسلم اقوام کے پُر جوش اسلامی جذبات ان کی سادہ دلی اور گرمجوشی ان کی قربانیاں اور سرفروشیاں اور اخلاص و وفا کی قیمتی سوغات (جس کا ان حکومتوں کے قیام اور غیر ملکی اقتدار سے آزادی میں سب سے بڑا اور براہ راست دخل ہے۔) افرنگیت اور مغربیت کے تنور کی حقیر ایندھن بن رہی ہے، سادہ لوح، بے زبان، سچے اور مخلص مسلم عوام، خاموشی اور سکون کے ساتھ بکریوں کے ریوڑ کی طرح نامعلوم منزل کیطرف ہنکائے جا رہے ہیں اور یہ طبقہ ان کی قسمت کا مالک بن گیا ہے۔ (نحو التربیۃ الاسلامیۃ الحرۃ۔ ص ۴۳-۴۵)

کیا آج کوئی اسلامی ملک اور کوئی اسلامی حکومت، کوئی بڑی اسلامی یونیورسٹی اس آواز پر لبیک کہہ سکتی ہے۔ اور اپنی ساری کوششیں، توجہات اور ذرائع و وسائل اس اہم تعمیری اور انقلابی نقطۂ آغاز پر مرکوز کر سکتی ہے جو بالآخر عالمِ اسلام کو اس سب سے بڑے خطرہ اور چیلنج سے بلکہ مکمل تخریب کے اس عمل سے (جو جاری ہے اور جس سے بڑی عمومی، ہمہ گیر، دور رس قومی تباہی و بربادی ہمیں اقوام و مذاہب اور تہذیب و تمدن کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔) بچا سکتی ہے۔؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

* ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ۔ (۲-۱۹۵) اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

* ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق۔ (۱۷-۳۱) اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرنا۔

یہ قتل معنوی اس قتل جسمانی سے کسی طرح کمتر نہیں، اس زود اثر اور مہلک زہر میں جو چشم زدن میں انسان کو موت کی نیند سلا دے اور اس زہر میں جس میں انسان گھٹ گھٹ کر مرے نتیجہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ اور قرآن مجید نے دونوں سے منع کیا ہے۔

* ولا تقتلوا انفسکم ان اللہ کان بکم رحیما۔ (۴-۲۹) اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو کچھ شک نہیں کہ خدا تم پر مہربان ہے۔